آزادی سے پہلے

مسلمانوں کا ذہنی رویہ

غلام کبریا

ترجمہ: حسن عابدی

مشعل

آزادی سے پہلے

مسلمانوں کا ذہنی رویہ

غلام کبریا

ترجمہ: حسن عابدی

مشعل

آر- بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور54600' پاکستان

آزادی سے پہلے مسلمانوں کا ذہنی رویہ

غلام کبریا

اردو ترجمہ: حسن عابدی

ناشر: مشعل بکس
آر-بی-5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور-54600، پاکستان
فون و فیکس: 042-35866859
Email: mashbks@brain.net.pk
http:/www.mashalbooks.org

چونکہ مسلمان حکمران طبقے کی جگہ کمپنی نے لے لی تھی اس لئے مسلمان رؤسا اس سے خوش نہیں تھے۔ اگرچہ کمپنی کے بڑے افسر مقامی ثقافت کے بعض پہلوؤں کی طرف مائل ہو سکتے تھے لیکن لوگوں کے درمیان کرنے والے اور متعلقہ علاقے کے عوام سے رابطے میں آنے والے افسر مقامیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے۔ کمپنی نے ٹھگوں، پنڈاریوں اور دوسرے مجرموں کا معاشی مسئلہ تو حل کر لیا لیکن عام مسلمان شدید معاشی بدحالی میں مبتلا تھے۔ سب سے بڑی شکایت چھوٹے اور درمیانہ درجے کے غیر حاضر مالکان اراضی، بڑے زمینداروں اور بالائی متوسط طبقے کے رئیسوں کو تھی۔ ان کے شکوے شکایتیں بڑھتی جا رہی تھیں، یہاں تک کہ انگریزی فوج کے ہندوستانی ملازموں تک پھیل چکی تھیں۔ بہت سی روایتیں جو ممکن ہے درست نہ ہوں ہندوستانی سپاہیوں کے درمیان گردش میں تھیں۔ ان میں سے ایک شکایت یہ تھی کہ انہیں جو کارتوس فراہم کیا جاتا ہے وہ ایسے خول میں رکھا جاتا ہے جس میں سور اور گائے کی چربی ہوتی ہے۔ اس خول کو دانتوں سے کھولنا پڑتا ہے چنانچہ ہندو اور مسلمان دونوں سخت ناراض تھے کہ اس طرح ان کے منہ میں مذہبی عقائد کی خلاف ورزی ہو رہی تھی۔

ان سب باتوں سے انگریزوں کے خلاف نفرت اور کشیدگی بڑھ گئی۔ لارڈ لیک کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب 1851ء میں لارڈ ڈلہوزی کو گورنر جنرل بنایا گیا تھا۔ ڈلہوزی نے ایسے اقدامات کئے جن سے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے بالائی طبقے میں کچھ اور زیادہ لوگ خفا رہنے لگے۔ اب حکمرانی کے جواز کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی اور مطالبہ یہ ہو رہا تھا کہ بادشاہ کو جس کا وجود محض ایک سائے کی طرح رہ گیا تھا لال قلعہ حویلی چھوڑ دینا چاہئے۔ ڈلہوزی کا خیال تھا کہ یہ جو درجنوں پنشن خوار ہیں مثلاً اودھ کی بیگمات، تانتیا توپی، کانپور کے مرہٹے اور رانی جھانسی ان سب کا وجود محض بوجھ ہے۔ ڈلہوزی نے ان سب کو نوٹس بھجوا دیئے کہ آئندہ پنشن نہیں ملے گی اور وہ ہندوستانی ریاستیں بھی جن میں کوئی بیٹا وارث تخت نہیں موجودہ حاکم کے بعد اپنا وجود کھو دیں گے۔ ڈلہوزی کے ذہن میں ایسے بہت سے احمقانہ خیالات تھے۔ شمالی ہند کا درمیانہ طبقہ جن معاشی مسائل میں گرفتار تھا ان اقدامات سے ان میں اضافہ ہوا۔ اس طرح مخالفوں کا ایک چھوٹا سا لیکن طاقتور اور بااثر گروہ پیدا ہو گیا۔ یہ ایک ٹائم بم تھا جس کی سوئی آگے جا رہی تھی اور اسے

دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ لارڈ لیک اور لارڈ ولیم بینٹک جیسے لوگ نہیں رہ گئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ کمپنی میں اہلیت باقی نہیں رہی تھی۔

1855ء میں لارڈ ڈلہوزی کی جگہ لارڈ کیننگ کا تقرر عمل میں آیا جو نسبتاً زیادہ دور اندیش تھا لیکن اس وقت تک بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ 1857ء میں جب میرٹھ میں ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی تو ٹائم بم پھٹ پڑا۔ مغرب میں یہ بغاوت دہلی اور انبالہ تک پھیل گئی۔ مشرق میں لکھنو اور جنوب میں کانپور اور جھانسی اور ان کے درمیان کچھ اور بھی مقامات اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ بعض جگہوں پر انگریزوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا گیا۔ مثال کے طور پر کانپور میں مرہٹہ تانتیا توپی نے ایسا کیا۔ دوسرے مقامات پر اس طرح کے قتل عام کو روکا گیا مثلاً بجنور کے ایک عدالتی افسر سرسید احمد خاں نے جو بعد میں ایک عظیم مصلح تسلیم کئے گئے، قتل عام کو روکا۔

بہر طور ایک سال سے بھی کم مدت میں اس بغاوت کو سفاکی کے ساتھ کچل دیا گیا گیا۔ حقیقتاً انگریزوں کے عتاب کو صرف لکھنو نے ایک سال برداشت کیا۔ دوسرے مقامات پر انگریزوں نے اپنی عملداری 1857ء کا سال ختم ہونے سے پہلے بحال کرا لی تھی۔ اس بغاوت کو اتنی جلدی کچل دینا کس طرح ممکن ہوا جبکہ انگریز سپاہیوں کی تعداد پورے ہندوستان میں بہت مختصر یعنی تقریباً بیس ہزار تھی اور اصل کارروائی کے علاقے میں یہ تعداد دس ہزار سے کم تھی، باقی ملک میں یہ دور دور تک بکھرے ہوئے تھے؟ 1867ء کی بغاوت کے بارے میں ہر ممکن ذرائع سے جو تفصیلات ملی ہیں۔ ان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت کہیں بھی عوامی بغاوت کی نہیں تھی۔ عام آبادی خاموش تھی۔ بیشتر مسلح گروہ جن کا تعلق کسی غیر مطمئن رئیس سے یا ماضی کے کسی پرانے جنگجو سردار سے تھا، باغی ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ اس شورش میں شامل ہوئے۔ انگریزوں کی حکمت عملی یہ تھی کہ ایک وقت میں ایک گروہ کا صفایا کیا جائے اور آخر میں ساری انگریز افواج ایک ساتھ مل کر لکھنؤ کو دوبارہ فتح کرنے کے لئے اس کا محاصرہ کر لیں۔

ادھر تو دہلی، لکھنؤ اور جھانسی کے مثلث میں لڑائی کا بازار گرم تھا، ادھر کلکتہ، بمبئی اور کراچی میں یہاں تک کہ دور افتادہ مدراس میں مکمل امن قائم تھا۔ حد تو یہ کہ پٹنہ، پشاور، جے پور، ناگپور اور لاہور بھی بڑی حد تک پرامن رہے۔ اس طرح انگریزوں کے لئے یہ

ممکن ہو سکا کہ جنگ کے محاذ پر اپنے زیادہ دستے بھیجیں۔ ساتھ ہی ہندوستانی ریاستیں جیسے حیدرآباد، میسور، جیغ پور اور راجپوتانہ کی دیگر ریاستیں اور جنگ کے علاقے سے قریب بھرت پور، بھوپال، الور اور پٹیالہ، یہاں تک کہ رام پور اور گوالیار کی ریاستیں جو جنگ کے ہی علاقے میں تھیں سپاہیانہ انداز سے انگریزوں کی پشت پر تھیں۔

وہ فوجیں جو جنگ آزادی کو دبانے کے لئے سرگرم تھیں، ان میں بھاری اکثریت ہندوستانی سپاہیوں کی تھی، انگریز تو محض تھوڑے سے تھے۔ صرف افسر سارے انگریز تھے۔ دارالحکومت دہلی کو فتح کرنے کا اعزاز آخر صوبیدار صاحب خاں ٹوانہ اور ان کے ساتھ بریگیڈیئر نکلسن کو ہی ملا۔ لہٰذا آخری تجزیے میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ 1857ء کی جنگ آزادی ایک غیر ملکی قابض فوج کے خلاف اس طرح کی جنگ نہیں تھی جیسی جنگیں الجزائر، ویت نام یا بیسویں صدی کے وسط میں بہت سی دیگر نوآبادیات میں لڑی گئیں۔ باقی رہی یہ بات کہ گورا انگریزی فوج نے اپنی باغی رعایا کو ایک انتقامی جذبے کے ساتھ سخت سزا دی تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ حیران کن بات تو یہ ہے کہ برطانوی فوج میں بھاری تعداد ہندوستانیوں کی تھی، ان میں بھی زیادہ تر مسلمان تھے جنہیں نکلسن ٹیکسلا اور پوٹھوہار سے لایا تھا اور صاحب خاں ٹوانہ اپنے آدمی مٹھا ٹوانہ شاہپور اور عیسیٰ سے لائے تھے، جو اب اسلامی جمہوریہ پاکستان میں واقع ہیں۔

بیشتر ہندوستانی مصنفوں، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے جنگ آزادی میں ناکامی کا سبب انگریزوں کی عیاری اور ہندوستانیوں کی دغا بازی بیان کیا ہے۔ اس ساری کارروائی کا کوئی سائنسی تجزیہ نہیں ہوا۔ پہلی بات تو یہ کہ ہر ایک نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ مغل سلطنت کے خاتمے اور خاص طور پر 1740ء میں دہلی کی تباہی اور یقینی طور پر بکسر کی لڑائی کے بعد ہندوستانی قومیت تحلیل ہو کر اپنا وجود کھو چکی تھی۔ اب ہر فرد کا تعلق صرف اپنی ذات سے تھا۔ پنجابی اور پختون مسلمان انگریزوں کی مدد تشکر کے جذبے سے کر رہے تھے۔ کیا انہیں یاد نہیں تھا کہ انگریزوں نے ہی انہیں سکھوں کے جابرانہ بلکہ ظالمانہ تسلط سے نجات دلائی تھی البتہ سکھ انگریزوں کے ہاتھوں شکست کے بعد سات ہی سال کے اندر ان کی مدد کیوں کر رہے تھے؟ یہ بات ضرور وضاحت طلب ہے۔ پنجاب کے مشرقی اور نصف سے کم علاقے میں سکھوں کے ماتحت جیسا کہ انگریزوں کی عملداری میں بھی تھا،

مسلمان اقلیت میں تھے اور سکھوں کی خاصی تعداد ہندوؤں کے ساتھ مل کر اکثریت میں تھی بیشتر سکھ کاشتکاری کرتے تھے۔ وہ خود کاشت کرنے والے چھوٹے مالکان اراضی تھے۔ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں بھی ان پر ناوا جب طریقے سے بھاری ٹیکس لگایا گیا تھا اس کے بعد اس ٹیکس نے ناقابل برداشت جبری وصولی کی جگہ لے لی۔ انگریزوں نے پہلا قدم اٹھایا کہ اراضی پر مال گزاری کا ایک زبردست اصلاحی ضابطہ نافذ کیا جس سے ٹیکس کی شرح گر کر رنجیت سنگھ کے زمانے کے ٹیکس سے بھی کم ہوگئی لہٰذا سکھ انگریزوں کے ممنون ہوئے اور انہیں پسند کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی سابقہ سکھ فوج کے سپاہی منتشر اور بیروزگار ہو گئے اور قابض فوج کے لئے مصیبت بن گئے کیونکہ ان میں سے کئی ایک جاتے جاتے بندوقیں ساتھ لے گئے اور قابض فوج کیلئے مصیبت بن گئے کیونکہ ان میں سے کئی ایک جاتے جاتے بندوقیں ساتھ لے گئے تھے اور اب انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ نتیجہ یہ کہ امن عامہ کی حالت خاصی بگڑ گئی جو کیفیت سکھ حاکموں کی نااہلی کی وجہ سے ان کے زمانے میں تھی۔ بگڑتی ہوئی صورتحال کے سبب اس میں اضافہ ہوگیا۔ اس صورتحال پر قابو پانے کے لئے انگریزوں نے ان میں سے چند کو خود اپنی فوج میں شامل کر لیا۔ باقی افراد کے لئے انہوں نے کچھ تعمیراتی منصوبوں پر کام شروع کیا۔ دراصل نہروں کی کھدائی اولاً سکھوں کی ڈکیتی لوٹ مار پر قابو پانے کے لئے ہی شروع کی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں حسن انتظام کی بدولت امن عامہ کی صورتحال غیر معمولی طور پر سدھر گئی اور یوں معیشت بھی بہتر ہوگئی۔ یہ تھے وہ اقدامات جن کی بنا پر سکھوں نے 1857ء میں انگریزوں کی مدد کی۔ یہ سب کچھ پنجاب پر قبضے کے بعد سات ہی سال کے اندر رونما ہوا جس کا سہرا انگریزوں کے ماہرانہ طرز حکمرانی کے سر جاتا ہے۔ لہٰذا 1857ء کی جنگ آزادی یا اسے آپ جو بھی نام دیں اس کی ناکامی کے اسباب بخوبی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ 1857ء کی شکست بہت المناک تھی اور اس نے عام لوگوں پر ان کے غیر جانبدار رہنے کے باوجود بڑے مصائب کا بوجھ ڈالا۔

ایک قوم کے ہاتھوں دوسری قوم کی محکومی ذلت آمیز ہوتی ہے لیکن یہ محکومی اس وقت تو اور بھی باعث توہین ہو جاتی ہے جب حاکم قوم کے مقابلے میں محکوم کہیں زیادہ بڑی ہو۔ یہ ذلت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب محکوم قوم اپنی محکومی کے اسباب کی صفائیاں پیش

کرنے لگے۔ مغلیہ ہندوستان میں حالات خواہ کچھ بھی رہے ہوں، جن کے تحت ایک چھوٹے سے ملک انگلینڈ نے اسے فتح کر لیا لیکن یہ بات تمام ہندوستانیوں کے لئے ذلت آمیز ہونی چاہئے تھی۔ اور زیادہ اندوہناک بات یہ تھی کہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لئے ذلت آمیز ہونی چاہئے تھی۔ اور زیادہ اندوہناک بات یہ تھی کہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں نے اپنی شکست کا الزام انگریزوں کی عیاری کے سر تھوپا اور یہ کہا کہ انہوں نے ہندوستانیوں میں غدار پیدا کئے جنہوں نے ملک سے بدعہدی کی۔ جنگیں، کتاب میں لکھے ہوئے اصولوں کے مطابق کسی کھیل کی طرح نہیں لڑی جاتیں۔ جنگ میں دشمن کے خلاف سازش کو جائز ہتھیار تسلیم کیا جاتا ہے۔ حکمرانی کی اعلیٰ ترین سطح پر اسے ماہرانہ انداز حکومت میں شامل کیا گیا ہے جو لوگ سازش کا شکار ہو جاتے ہیں خواہ وہ میدان جنگ میں ہوں یا بین الاقوامی سیاست میں وہ بہر طور نااہل ہوتے ہیں لہٰذا شکست ان کا مقدر ہوتی ہے۔ اپنی محکومی کی حقیقت کا اقرار کرنے کے بجائے ہندوستانی اور پاکستانی بچ کر نکل جانا چاہتے ہیں۔ جنگیں فتح کی خاطر لڑی جاتی ہیں اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ انگریزوں نے غداروں کو آگے بڑھایا تو یہ اس معاشرے کی بیماری تھی جس میں ایک غیر ملکی طاقت کو ان لوگوں کی خدمات میسر آ گئیں جو پیسے کی خاطر اپنی قوم سے غداری کر سکتے تھے اور ایک حملہ آور کیلئے اسے فتح بھی کر سکتے تھے۔

اس ذلت کے باوجود جو محکومی پیدا ہوئی، انگریزوں نے 1707ء کے قانون کی منظوری کے بعد ہندوستان میں اصلاح احوال کے لئے بہت کچھ سیکھا۔ انہوں نے یہاں ایک آزاد عدلیہ قائم کی۔ جدید تعلیم کو رواج دیا اور ان سب کے علاوہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کو متعارف کرایا۔ ان کے علاوہ انگریزوں نے ادارے قائم کئے۔ بہت کچھ ہم سے کھو چکا ہو گا لیکن پھر بھی اتنا باقی رہ گیا تھا کہ اگر ایک بیدار روشن ہوش مند رائے عامہ ہوتی اور دیانتدار قیادت بھی ہوتی تو ہم تعمیر نو کر سکتے تھے۔

آخر میں اس بات پر زور دینا ضروری ہو گا کہ معاشروں اور تہذیبوں کے درمیان جنگیں، ذہنوں اور دلوں کی جنگیں ہوتی ہیں۔ یہ معلومات کی اور علم کی جنگیں، نئے تصورات اور تازہ افکار، حوصلہ مندی اور پہلکاری، زندگی کی اعلیٰ اقدام اور انسانیت کے ساتھ رحمدلی کے جذبے کے درمیان جنگیں ہوتی ہیں۔ مسلمانوں نے اسلام کے اپنے زریں

ایام میں دماغ اور دل کی یہ جنگیں کامیابی سے سرکیں۔ جنگ کے میدان میں ان جنگوں سے ان کے دلوں اور دماغوں میں ہونے والی معرکہ آرائیوں کا پتہ چلتا تھا۔ اس کے علاوہ اسلام نے اپنے زریں اور دماغوں میں ہونے والی معرکہ آرائیوں کا پتہ چلتا تھا۔ اس کے علاوہ اسلام نے اپنے زریں زمانے میں یونان، ایران، ہندوستان اور چین کے علوم اور ذہنی سرمائے سے بے حد استفادہ کیا۔ اسلام کا خاص عطیہ یہ تھا کہ اس نے انسانی تہذیب کو سماجی مساوات اور انصاف کی ضمانت دی۔ اس کے ساتھ ہی معاشرے کو مفادات سے محروم لوگوں کی فلاح کا ذمہ دار قرار دیا۔

پندرہویں صدی کے بعد سے جب مسلمانوں نے دماغ اور دل میں ہونے والی جنگیں ہارنا شروع کیں تو ہر میدان جنگ میں شکست کھانے لگے۔ یہی وقت تھا جب مغرب میں یونانی افکار اور علوم کی تجدید کے ساتھ نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوا۔ مغرب نے روشن خیالی کے اس دور میں اسلامی، ہندی اور چینی افکار سے اپنی تہذیب کو مالا مال کیا لیکن مغرب کے بہترین عطیہ کا فروغ برطانیہ میں ہوا جہاں جمہوریت تھی، عوام کا اقتدار تھا، آزاد عدلیہ تھی ارفکر و اظہار کی آزادی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں مغرب کی شہنشاہیت کو لانے کے علاوہ یہاں مغرب کے افکار و علوم بھی درآمد کئے لیکن ان سب کے سوا اس نے ایک نظام پیش کیا جس کی بنیاد شخصیات پر نہیں بلکہ اداروں پر قائم تھی اور وہ اس لئے کہ اس کی پشت پر جمہوریت، آزاد عدلیہ، سوچنے اور اظہار کرنے کی آزادی تھی، جس نے عوام کے اقتدار کی یقینی ضمانت دی تھی۔ ہندوستانی مسلمان مغرب کی شہنشاہیت کے اسیر ہونے کے بجائے تجسس اور تحقیق سے کام لیتے تو وہ بھی مغرب کے خیالات سے اور انگریوں کے تصور جمہوریت سے استفادہ کر سکتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی یہ سب سے بڑی ناکامی تھی یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ورثے اور مغرب کے افکار سے بہرہ مند ہونے سے ان کی محرومی۔ اس کے بجائے وہ مغربی شہنشاہت کا شکار ہو گئے۔ یہ تھا آزادی سے پہلے مسلمانوں کا اندازفکر۔

اب یہ دیکھتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی یا برطانوی ہند کی سلطنت کے وارث ہوتے ہوئے، ہندوستان کے مسلمانوں نے ورثے میں کیا پایا؟

برطانیہ کی حکمرانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسط سے بالواسطہ تھی۔ 1858ء میں اس کی جگہ براہ راست حکمرانی کا آغاز ہوا۔ ویسٹ منسٹر میں ملکہ وکٹوریہ کے نام سے برطانوی پارلیمنٹ نے قانون منظور کیا۔ ہندوستان کے گورنر جنرل کو بھی تاجدار برطانیہ کا وائسرائے بنایا گیا۔ اگرچہ کمپنی کی حکومت میں عدلیہ کا ادارہ متعارف ہو چکا تھا، براہِ راست برطانوی حکومت کے تحت انصاف زیادہ صاف ستھرا ہو گیا۔ 1858ء کے چند عشروں بعد ہندوستانی بھی، اگرچہ تعداد میں کم سہی لیکن بہرطور ہائیکورٹ کے جج مقرر کئے جانے لگے اور ضلعی سطح پر ججوں کی تعداد خاصی بڑی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ عدلیہ صاف ستھری اور منصفانہ تھی اور اس کے دروازے سارے ہندوستانیوں پر کھلے تھے تاہم عدلیہ شاہی مفادات سے مشروط تھی۔

برطانیہ کی براہ راست حکومت میں سب سے پہلے انتظامیہ کو مستحکم بنانے کا کام ہوا۔ کمپنی میں اس کی نوعیت بہرطور ذاتی تھی اور قدرے بددیانت بھی اور زیادہ منظّم بھی نہیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اور تجربے کی بنیاد پر انتظامیہ کے دونوں بازوؤں کو یعنی سول سروس اور پولیس سروس کو مستحکم کیا گیا، چنانچہ یہ ادارے زیادہ معقول اور منظّم ہو گئے۔ تمام صوبوں میں بھی انڈین سول اور پولیس سروس متعارف کرائی گئیں۔ یاد رہے کہ سول سروس کا قیام سب سے پہلے شاہی مفادات پورا کرنے کے لئے تھا۔ اس کے باوجود اس نے ہندوستانیوں کو بھی فرداً فرداً جان و مال اور عزت و آبرو کا مکمل تحفظ فراہم کیا، اس کے باوجود ان کا قومی وقار قدرے متاثر ہوتا تھا۔

تعلیم کا ابتدائی ادارہ 1835ء میں قائم ہوا تھا لیکن بیس سال بعد ہی 1858ء میں یہ ایک مکمل ادارہ بن گیا۔ اس میں مرکزی اور صوبائی دونوں سطح پر تعلیم کے محکمے کھل گئے۔ سارے ملک میں یونیورسٹیاں، کالج اور سکول قائم ہو گئے پھر جہاں کہیں اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی مزید ایسے ادارے کھولے گئے۔ مثال کے طور پر مدراس پریسیڈنسی میں اور مغربی بنگال کے مغربی ہندو اکثریتی علاقے میں ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ یوپی، بہار اور مشرقی بنگال کے مسلم اکثریتی علاقے میں اس کی رفتار سست رہی اور مغربی پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان اور سارے مسلم اکثریتی علاقوں میں تعلیمی اداروں کے قیام کی رفتار انتہائی سست رہی۔ 1910ء کے بعد بمبئی پریسیڈنسی میں اور آزادی کے بعد مہاراشٹر

دور میں حکومت کی نوعیت ذاتی تھی۔ برطانوی حکومت نے اسے اداروں میں بدل دیا تاہم وقت اور حالات میں تبدیلی اور سماجی اور سیاسی صورت حال میں فرق کے پیش نظر جب بھی ضرورت محسوس ہوئی تفصیلات میں معمولی رد و بدل کرنا پڑا۔ اس میں اہم بات سامراجی مفادات کی تھی۔ بیشتر صورتوں میں تو عہدے بھی وہی رکھے گئے جو پہلے تھے جیسے پٹواری، قانون گو، پیش کار، واصل باقی نویس، تحصیل دار وغیرہ، صرف ناظم کو بیشتر ہندوستان میں کلکٹر بنا دیا گیا۔ سوائے اودھ کے بعض علاقوں کے اور پنجاب کے جہاں وہ ڈپٹی کمشنر کہلاتا تھا یا پھر ایک کوتوال شہر میں پولیس کا ایس ایچ او (اسٹیشن ہاؤس آفیسر) بنا دیا گیا۔

تاہم ایک بڑی اور رجعت پسندانہ تبدیلی یہ ہوئی کہ دیہی پنچایتیں جو ہندوستان میں زمانہ قدیم سے رائج چلی آ رہی تھی انہیں خاموشی سے ختم ہو جانے دیا گیا۔ یہ پنچایتیں گاؤں کے بزرگوں کی مشاورتی کونسلیں ہوتی تھیں۔ ان کا انتخاب نہیں ہوتا تھا لیکن گاؤں والوں کی صوابدید سے مقرر ہوتے اور ان کی اخلاقی حمایت حاصل ہوتی۔ پنچایتیں گاؤں کے تقریباً تمام معاملات کا انتظام چلاتیں جن میں ابتدائی پولیس کا کام بھی شامل ہوتا۔ وہ جھگڑے نبٹاتیں اور بنیادی عدلیہ کی طرح کام کرتی تھیں۔ یہ ادارہ مغلوں کے آخری زمانہ میں روبہ زوال تھا۔ انگریزوں نے اسے مرنے دیا اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے اور بہت زیادہ قابل مذمت بھی نہیں اس سے دیہاتیوں کو یہ اشارہ ملتا تھا کہ وہ انگریز کے مقرر کردہ حاکم سے رجوع کئے بغیر اپنے معاملات خود طے کرنے میں آزاد نہیں۔ آزادی کا یہ احساس سامراجی مفادات کے منافی تھا۔ یہاں تک کہ منتخب لوکل ادارے بھی ایک کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر کے آگے ان لوگوں سے زیادہ جواب دہ تھے جنہوں نے انہیں منتخب کیا۔

آخری اور انگریزوں کا قائم کردہ اہم ترین ادارہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کا قیام تھا جس کی پر اسس جمہوریت کے تصور پر تھی۔ لوکل باڈیز کی طرح مرکزی اسمبلیوں کا آغاز بھی وائسرائے کی نامزد کردہ امپیریل کونسل سے ہوا اس کے بعد محدود حق رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کا طریقہ رائج ہوا۔ رائے دہی کا دائرہ وقت گزرنے کے ساتھ پھیلتا گیا اور آزاد سے کچھ پہلے عام حق رائے دہی تسلیم اور رائج کیا گیا۔ اس کے بعد مرکزی اسمبلیوں کی طرح صوبائی اسمبلیاں بنائی گئیں اور آزادی سے کچھ ہی عرصہ پہلے ان کے ارکان کا انتخاب عام رائے دہی کی بنیاد پر ہوا۔ اس ادارے کو ایک انگریز سول افسر نے ایک سیاسی پارٹی بنا کر

مستحکم کیا۔ یہ تھی انڈین نیشنل کانگریس جو انیسویں صدی کے اواخر میں قائم ہوئی۔ چند عشروں کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی اس کے بانی برطانیہ کے وفادار مسلمان جاگیر دار تھے۔ بعد ازاں 1920ء اور 1930ء کے عشروں میں اور بھی سیاسی پارٹیاں بن گئیں۔

حوالے

1۔ این کے سہنا کی تصنیف حیدر علی (مکرجی اینڈ کمپنی کلکتہ)
2۔ عبداللہ ملک کی تصنیف مولانا احمد علی لاہوری

ایکڑ سرکاری زمین ڈیفنس آفیسرز کوآپریٹو سوسائٹی کونہایت ارزاں دام پر دے دی گئی۔ ٹیکس گزاروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے اس زمین کو ڈیولپ کیا گیا۔ اس پر پلاٹ نکالے گئے اور یہ پلاٹ فوجی افسروں کو مکان بنانے برائے نام قیمت پر دے دیئے گئے جن لوگوں کو وہ پلاٹ ملے ان میں سے بیشتر نے انہیں نہایت مہنگے داموں بیچ دیا۔ اس طرح ایوب نے آبادی کے ایک بااثر حصے میں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا جو اس غاصب کے ذاتی طور پر وفادار ہو گئے۔

اپنے ناجائز اقتدار کو محفوظ بنا لینے کے بعد، ایوب نے اپنے گرد خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں کا ایک ہجوم اکٹھا کر لیا تھا۔ ان میں سے بعض عناصر نے جن کے سرغنہ ذوالفقار علی بھٹو تھے، ایوب کا نام تاریخ میں لکھوانے کے لئے ایک نہایت نادر طریقہ نکالا۔ انہوں نے ایوب کو مشورہ دیا کہ کشمیر کو دوبارہ فتح کرنے کے لئے وہاں تربیت یافتہ چھاپہ مار مجاہدین کے طور پر بھیجیں تا کہ وہ وادی میں گوریلا جنگیں شروع کر دیں۔ اس سے دنیا یہ باور کر لے گی کہ یہ کشمیریوں کی جائز طور پر اپنی بغاوت ہے۔ 1965ء کے وسط میں اس کارروائی کا آغاز ہوا اور بڑے دھوم دھام سے ہوا۔ کشمیری مجاہدوں کی کامیابیوں کی خبروں سے اخبارات کے کالم کے کالم سیاہ ہوتے گئے۔ اس طرح عوام کو ایوب کا طرفدار بنایا گیا۔ فوری بعد پاکستانی فوج نے ایک محاذ جموں گجرات بارڈر پر جو چھمب جوڑیاں سیکٹر کے نام سے مشہور ہے، کھول دیا۔ یہ گویا ہندوستانی فوج کو سزا دینے کے لئے تھا جو کشمیریوں اور مجاہدوں پر ستم ڈھا رہے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ کام جنرل اختر ملک کے سپرد کر دیا گیا تھا جو ایک نہایت اہل جنرل تھے، اگرچہ پاکستانی جرنیلوں میں ایسے لوگ نایاب ہیں۔ جنرل اختر ملک آناً فاناً جموں میں راوی دریا کے کنارے پہنچ گئے۔

ہندوستانی فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ ان کے فوجی دستے نے 5 اگست 1965ء کو لاہور اور سیالکوٹ کے اضلاع میں بین الاقوامی سرحد کو عبور کر لیا اور مشرق میں پاکستانی علاقے پر سیکڑوں میل تک قبضہ کر لیا۔ یہ علاقہ لاہور میں بی آر بی نہر کے علاقے سے موسوم تھا۔ انہوں نے مزید کئی سو مربع میل زمین ضلع سیالکوٹ میں اپنے قبضے میں لے لی لیکن پاکستان نے راجپوتانہ کے غیر آباد بنجر ریگستان میں واقع ہندوستان کے ہزاروں مربع میل علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اور اخبارات میں کامیابی کی خبریں جس کروفر

سے سنائی جا رہی تھیں ان سے عام لوگ بہت خوش ہوتے تھے لیکن اس سے پہلے کہ پاکستانی فوج پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیتی اور مجاہدین کشمیر فتح کر لیتے اقوام متحدہ نے مداخلت کر دی اور جنگ بند کرا دی۔ اطلاع یہ ہے کہ اقوام متحدہ کی اس مداخلت کا اہتمام ''فتح مند پاکستانی حکمرانوں'' نے خود کیا تھا۔ پاکستان کے لوگ اس سے بہت مایوس ہوئے اورانہوں نے بڑی طاقتوں پر پھٹکار بھیجی جنھوں نے پاکستان کو اس کی اچھی بھلی کامیابی سے محروم کر دیا تھا۔

سوویت یونین نے تاشقند کے مقام پر ہندوستان اور پاکستان کے مابین ایک امن کانفرنس کا اہتمام کیا اس میں جس امن سمجھوتے کی دستاویز پر دستخط ہوئے اس سے پاکستان کی فتح ظاہر نہیں ہوئی تھی جو ان کے یقین کے مطابق پاکستانی فوج نے حاصل کی تھی۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں کی فوجیں بین الاقوامی سرحدیں چھوڑ کر اپنے اپنے علاقے میں واپس چلی گئیں۔ اس کے بعد بہت سے پاکستانیوں نے ایوب کے خلاف اس بات پر احتجاجی جلوس نکالے کہ پاکستان نے جو کامیابی حاصل کی اس کا تاثر اس سمجھوتے میں نہیں ملتا۔ لوگ بے حد دل شکستہ تھے اور عام طور پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ کانفرنس میں ہندوستان نے ایوب کو چمہ دے دیا۔

پاکستانی قوم کے خلاف یہ تو ایک اور بڑی بدعہدی تھی۔ عام لوگوں کی محرومی کا ازالہ کرنے اور ایوب کی اس ناکامی کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے الطاف گوہر نے جو ایک انتہائی ذہین افسر تھے اور ان کی سربراہی میں نوجوان چلتے پرزوں نے سال 1968ء کو عشرہ ترقی کا نام دے کر ایک جشن منانے کا اعلان کیا کیونکہ اس عشرے کا آغاز ایوب حکومت کی بدولت ہوا تھا۔ پھر تو پورے مشرقی اور مغربی پاکستان میں دور دور تک اور وسیع پیمانے پر سال بھر تک جشن منائے جاتے رہے۔ ادھر تو وہ جشن، جن کا وجود محض سرکاری سطح پر تھا، منائے جا رہے تھے، مردہ باتیں ہوئیں۔ ملتان کا بجلی گھر بند ہو گیا۔ اس سے مغربی پاکستان کا ایک بہت حصہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس عرصے میں چینی مہنگی ہو گئی۔ عام لوگ مشتعل ہو گئے۔ ایوب کے عشرہ ترقیات کا الٹا اور شدید ردعمل ہوا۔

اب چونکہ تجربہ کار سیاستدان موجود نہ تھے، لہٰذا اس کا خلا خوشامدیوں نے پر کیا جو زیادہ تر مغربی پاکستان کے جاگیردار طبقے سے تھے اور کچھ احتجاجی تھے، جن کا تعلق مشرقی

ہوا کہ وہ غلطی پر تھا۔ اس خیال سے کہ معمولی درجے کے مخالف لیڈر کہیں اہمیت نہ اختیار کر لیں بھٹو کو سیاسی بات چیت شروع کرنا پڑی حالانکہ وہ اس سے ہمیشہ بچتا آیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ وہ نہایت غیر اہم باتوں کو بنیاد بنا کر مذاکرات کو طول دیتا رہا، یہاں تک لیبیا کے سربراہ سے رسمی ملاقات کے لئے لیبیا چلا گیا۔

بھٹو کی لاتعلقی سے پی پی میں بدنظمی اور مایوسی پیدا ہو گئی اور جب تک وہ انتخابات کا اعلان کرتا، پارٹی محض برائے نام باقی رہ گئی تھی اب کوئی منظّم سیاسی جماعت باقی نہیں رہ گئی تھی جو احتجاجی مظاہروں کے خلاف اس کا دفاع کرتی۔ چنانچہ احتجاج کے شر کو دور رکھنے اور مظاہرین کو اپنی طرف لانے کے لئے اس نے کچھ اقدامات محض ان پر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسلام کی محبت میں وہ مولویوں سے زیادہ مخلص ہے۔ بھٹو کے خلاف احتجاجی مہم میں مولوی آگے تھے۔ بھٹو نے شراب کی فروخت پر پابندی لگا دی اور اتوار کے بجائے جمعہ کی تعطیل کا اعلان کیا۔ اس کے عقائد میں بڑی لچک تھی، اس سے پہلے بھٹو نے قادیانیوں کو کچھ انہی اسباب کے تحت غیر مسلم قرار دے دیا تھا حالانکہ قادیانی پوری طرح اس کی حمایت کر رہے تھے۔

لیکن جون 1977ء میں بھٹو کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی چالیں بے اثر ہو گئیں، چنانچہ وہ سنجیدہ مباحثوں کیلئے جم کر اکیلا بیٹھ گیا۔ اکیلا اس کے لئے کہ اس کی اپنی سیاسی پارٹی بے توجہی اور مایوسی کے باعث سیاسی عمل کی طاقت کھو چکی تھی۔ 4 جولائی 1977ء کو رات گئے امن کی شرائط طے پا گئیں۔ بھٹو کو صرف بیس یا تیس نشستوں پر دوبارہ انتخابات کرانے تھے۔ اس کے مخالفوں نے اپنی عزت بچانے کی خاطر اس پر اتفاق کر لیا۔ انہیں یہ علم تھا کہ بھٹو کی طلسماتی کشش ابھی باقی ہے اور اس کی کامیابی یقینی ہے۔

بھٹو مذاکرات میں اپنی کامیابی کا جشن منانے کے بعد اطمینان کے ساتھ سونے چلا گیا۔ کوئی آدھی رات کو اس کی خواب گاہ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ سبب جاننے کے لئے وہ باہر نکلا۔ ایک فوجی افسر نے اسے سلیوٹ کیا اور احترام سے کہا کہ ملک میں مارشل لاء لگ چکا ہے اور اب وہ حفاظتی تحویل میں ہے۔ بھٹو کو اس کے اپنے ہی تابعدار نے برطرف کر دیا تھا۔ چند سال بعد ضیاء الحق نے جس کا انتخاب فوج کی سربراہی کیلئے خود بھٹو نے کیا تھا، اسے پھانسی دے دی۔ جنرلوں نے صاف طور پر اندازہ کر لیا تھا کہ بھٹو کا جادو